اکتشافی تنقید: پروفیسر حامدی کاشمیری سے مکالمہ

مکالمہ نگار: سبزار احمد بٹ

لکچرر محکمۂ اسکولی تعلیم، جموں وکشمیر، موبائل: 9906417975

پروفیسر حامدی کاشمیری کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں نہ صرف کشمیر بلکہ برِصغیر کا اردو داں طبقہ ان کی جامع اور کثیر الجہت علمی شخصیت سے متعارف ہے۔ وہ کئی برسوں تک کالج اور یونیورسٹی سطح پر درس و تدریس کے پیشہ سے وابستہ رہے اور بالآخر کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے طور پر سبکدوش ہوئے۔ ان کا علمی سفر شاعری، فکشن نویسی، تحقیق اور تنقید کے متنوع وظائف پر محیط ہے۔ ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ پروفیسر حامدی کاشمیری کی شخصیت خود میں ایک جامع علمی ادارے کی حیثیت رکھتی ہے تاہم جس میدان میں انھوں نے اپنی ایک منفرد شناخت قائم کی وہ تنقید ہے۔ ان کی تنقیدی کاوشیں کم وبیش ۲۶ کتابوں پر محیط ہیں جن میں انھوں نے شاعری، فکشن اور نظریاتی تنقید کے منطقوں پر معنی خیز اور فکر انگیز مباحث قائم کیے ہیں۔ تنقید کے میدان میں جس کتاب نے ان کی منفرد شناخت قائم کی وہ ''اکتشافی تنقید کی شعریات'' ہے۔ یہ وہ کتاب ہے جس نے اردو میں ایک نئے تنقیدی ڈسکورس کی بنیاد رکھی، مذکورہ کتاب کو ادبی حلقوں میں سراہا بھی گیا اور کچھ لوگوں نے اعتراضات بھی قائم کیے، کچھ لوگوں نے یہ بھی شکایت کی کہ حامدی کاشمیری کی تنقیدی تھیوری موہوم اور ناقابلِ فہم ہے، لیکن افسوس کا مقام یہ ہے کہ ان سے ابھی تک ان کی تھیوری کے بنیادی مفروضات اور اس پر قائم کیے جانے والے اعتراضات کے حوالے سے کسی نے بھی مفصل گفتگو نہیں کی، اسی ضرورت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے راقم نے موصوف سے انٹرویو کی درخواست کی، جسے انھوں نے طبیعت کی ناسازی اور ضعیف العمری کے باوجود خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کیا جس کے لیے راقم ان کا شکر گزار ہے۔

پیش ہیں گفتگو کے اقتباسات:

س۔الف: حامدی صاحب! یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ آپ کی علمی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ دنیائے علم وادب میں آپ نقاد، محقق، شاعر اور فکشن نویس کی حیثیت سے ایک بلند مقام رکھتے ہیں تاہم ادب کے جس شعبے میں آپ نے اپنی صلاحتیوں کا لوہا منوایا ہے وہ تنقید ہے۔ یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ آپ کی تنقیدی بصیرت کا اعتراف پورے برِصغیر میں کیا جاتا ہے اور اس حوالے سے جس کتاب نے آپ کی منفرد شناخت قائم کی، وہ ''اکتشافی تنقید کی شعریات'' ہے۔ اس کتاب کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اردو میں تھیوری سازی کے تعلق سے یہ ایک منفرد کاوش ہے۔ پہلی بات تو میں آپ سے یہ پوچھنا چاہوں گا کہ اکتشافی تنقید کا جو خاکہ آپ کے ذہن میں ابھرا اس کے پسِ پشت کون سے اسباب وعوامل کارفرما رہیں، دوسری یہ کہ اگر ہمارے پاس پہلے سے ہی مشرقی ومغربی تصوراتِ نقد کی ایک اچھی خاصی تعداد موجود تھی اور اردو کے کم وبیش سارے نقاد قائم شدہ تصورات سے ہی اخذ و اکتساب کر کے ادب کی تحسین کے وظائف سرانجام دے رہے تھے اس کے باوجود آپ کو کیوں ادبی متون کی تحسین کے حوالے سے ایک نئے نظریے کی ضرورت محسوس ہوئی؟

ح۔ک: دیکھیے سب سے پہلے تو میں یہ کہوں گا کہ دنیائے علم وفکر کا تحرک اختلاف اور انحراف کی وجہ سے قائم ہے۔ اگر قائم شدہ علمی اور فکری وظائف سے اختلاف اور انحراف نہ کیا جاتا، تو آج علمی اور فکری اعتبار سے دنیا جس مقام پر کھڑی ہے اس کا حصول ناممکن تھا۔ اب جہاں تک آپ کے سوال کا تعلق ہے کہ میرے ذہن میں اکتشافی تنقید کا خاکہ کیوں کر ابھرا، تو اس حوالے سے میں یہ کہنا چاہوں گا جس زمانے میں، میں پرورشِ لوح وقلم میں آج کے مقابلے میں بہت زیادہ سرگرم تھا اس زمانے میں لکھنے کے ساتھ ساتھ میرا زیادہ وقت مطالعہ میں صرف ہوتا تھا۔ درس وتدریس، ادبی محافل میں شرکت اور انجمنوں کی میٹنگوں میں شرکت کو چھوڑ کر میرے پاس جتنا بھی وقت بچتا تھا میں اسے پڑھنے لکھنے میں صرف کرتا تھا اس دور میں اردو، انگریزی اور فارسی کے تخلیقی متون میرے مطالعے کے بنیادی معروضات میں شامل رہے، اس کے ساتھ ساتھ میں ان متون پر لکھی جانے والی تنقید کا بھی جائزہ لیتا رہا اس دوران خصوصاً جو چیز میرے مشاہدے سے گزری، وہ یہ کہ ہر تنقیدی کاوش کی تان بالآخر معنی پر آکر ٹوٹتی تھی چاہے وہ انگریزی تنقید ہو یا پھر اردو تنقید، آہستہ آہستہ میں نے یہ محسوس کیا کہ شعر یا افسانے کی تخلیقی شناخت اس میں پیش کیا جانے والا تجربہ قائم کرتا ہے

جو متن کی لسانی اکائیوں میں مستور ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر میں اپنا ایک شعر پیش کروں گا:

کوئی حسرت کوئی ارماں نہیں ہے
تیرے آنے کا اب امکاں نہیں ہے

اگر مروجہ تنقید کے تناظر میں اس شعر کو دیکھا جائے تو اس کی رو سے اس کے معنی یہ نکلتے ہیں کہ شاعر محبوب سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہے کہ تیرے آنے کا کوئی امکان نہیں ہے اس لیے مایوسی ہی مایوسی ہے اور شاعر اس شعر میں حد درجہ مایوسی کا اظہار کر رہا ہے۔ اس طرح کے اپروچ سے تنقید کا وظیفہ بے معنی ہو کے رہ جاتا ہے۔ تخلیقی متن میں مضمر جہت در جہت تجربہ پسِ پردہ ہی رہتا ہے۔ اردو اور انگریزی کی تنقیدی نگارشات کا مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ تخلیقی متن میں مستور تجربے کے حوالے سے کسی نے بھی نہیں لکھا ہے اس کے بعد میں نے اپنی تھیوری پر کام کرنا شروع کیا۔ اکتشافی تنقید سے متعلق جب میرے ذہن میں ایک ٹھوس خاکہ ابھرا تو میں نے سب سے پہلے اس کے بارے میں گوپی چند نارنگ کو لکھا، انھوں نے جواباً مجھ سے ایک دن کہا کہ ''حامدی صاحب میں یہ کہنے کی گستاخی کروں گا کہ آپ کا نظریہ غلط ہے، آپ کا اپروچ مذہبی ہے اور میں آپ کی تھیوری کے کسی بھی مفروضے سے متفق نہیں ہوں بہتر یہ ہوگا کہ آپ اپنے خیال کو ترک کریں'' لیکن نارنگ صاحب کی مخالفت کے باوجود میں اپنے نظریے پر قائم رہا۔ شعر و ادب کے مسلسل مطالعے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اصل میں لفظ ہی ہمیں شعر کی روح تک پہنچاتا ہے تفہیم شعر کے حوالے سے مروجہ تنقید کا اصرار معنی کی دریافت پر ہے، لیکن میرا موقف یہ ہے کہ شعر کی روح میں اترنے کے لیے معنی کے بجائے تجربے کی شناخت لازمی ہے جس کے بعد میں نے شعر و ادب کی تحسین کے حوالے سے مروجہ تناظرات سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ کیونکہ برصغیر میں لکھی جانے والی اردو تنقید کا دائرۂ کار متن سے کشیدِ معنی تک سمٹا ہوا تھا، ہر تنقیدی کارگزاری کی تان بالآخر معنی پر ہی آ کے ٹوٹتی تھی۔

س۔الف: حامدی صاحب آپ نے اپنی کتاب ''اکتشافی تنقید کی شعریات'' میں معنی کے بجائے تجربے کی دریافت پر زور دیا ہے۔ آپ کے مطابق شعر تجربے کا اکتشاف کرتا ہے نہ کہ معنی کا، لیکن آپ کے ایک شاگرد اور ماہر لسانیات پروفیسر نذیر احمد ملک نے ''بازیافت'' نامی رسالے میں آپ کی تھیوری کے حوالے سے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ حامدی صاحب معنی کے منکر نہیں بلکہ حامدی صاحب معنی کی وحدانیت کے منکر ہیں کیا آپ ان سے متفق ہیں؟ کیا تجربے اور معنی کی تکثیریت کو آپ ایک ہی چیز قرار دیتے ہیں؟

ح۔ک: دیکھیے نہ صرف پروفیسر نذیر احمد ملک نے بلکہ ان کے علاوہ بھی بہت سارے لوگوں نے میری تھیوری پر لکھا ہے اور کچھ دانش گاہوں میں اس پر تحقیقی مقالے بھی لکھے گئے ہیں۔ میری اطلاقی تنقید اور تھیوری کو کس نے کس تناظر میں سمجھا ہے میں اس پر پابندی عائد نہیں کر سکتا ہوں میری تھیوری یا کسی بھی تھیوری پر رائے قائم کرنا قاری کا جمہوری حق ہے جس کی معروضیت یا صداقت کو ثابت کرنا میرا کام نہیں ہے۔ جہاں تک معنی اور تجربے کا تعلق ہے تو میں نے اس پر اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ معنی الگ چیز ہے اور تجربہ الگ چیز ہے پھر سے میں آپ کو مثال دیتا ہوں، حال ہی میں، میں نے ایک غزل لکھی ہے اس کے چند شعر یوں ہیں:

کوئی حسرت کوئی ارماں نہیں ہے
تیرے آنے کا اب امکاں نہیں ہے
گھرا ہوں کالی دیواروں میں کب سے
نکل جانے کا اب امکاں نہیں ہے
سفر اب یم بہ یم جاری رہے گا
کوئی اندیشۂ طوفاں نہیں ہے

اگر ہم پہلے شعر کے سطحی معنی کو دیکھیں جیسے کہ میں نے آپ سے پہلے بھی کہا کہ اس کے معنی یہ نکلتے ہیں کہ شاعر محبوب کی آمد سے متعلق مایوسی کا شکار ہو چکا ہے، لیکن ان اشعار سے ابھرنے والا تجربہ تہہ در تہہ ہے، جہت در جہت صورتحال کا اکتشاف کرتا ہے۔ پہلے شعر کے حوالے سے بات کی جائے تو اس میں ایک فرضی صورتحال ابھرتی ہے، ایک شعری کردار سامنے آتا ہے جو شاعر کی ذات سے ایک الگ شناخت رکھتا ہے اور اپنی ماہیت کے اعتبار سے فرضی ہے حسرت اور ارماں کے الفاظ کردار کے داخلی منظر نامے کی نمائندگی کرتے ہیں اس شعر میں مخاطب کا کردار بھی ابھرتا ہے۔ مختصراً کہیں تو مذکورہ شعر ایک مکمل ڈرامائی صورتحال کی تجسیم کرتا ہے۔

اب اگر دوسرے شعر کے حوالے سے بات کی جائے:

گھرا ہوں کالی دیواروں میں کب سے
نکل جانا کوئی آساں نہیں ہے

تو اس کے معنی یہ نکلتے ہیں شاعر کہتا ہے کہ میں مشکلوں میں پڑ گیا ہوں، لیکن ان سے چھٹکارا پانا ناممکن ہے۔ اب اگر اس شعر سے ابھرنے والی ڈرامائی صورتحال کی بات کی جائے تو اس شعر سے ابھرنے والا شعری کردار ایک ایسے مکان میں مقید ہے جس کی دیواریں کالی ہیں۔ لفظ ''کالا'' اس شعر میں جن تلازمات Implicatures کو ابھارتا ہے یا

پھر شعر سے ابھرنے والا کردار اصل میں کس طرح کی صورتحال سے دوچار ہے۔

شعری کردار کالی دیواروں میں مقید ہے اسے دوسرے کردار پوچھتے ہیں کہ تو ان کالی دیواروں میں مدتِ دراز سے مقید ہے اب تجھے اپنی رہائی کی سبیل کرنی چاہیے، لیکن یہ ان سب سے کہتا ہے کہ ''نکل جانا کوئی آساں نہیں ہے''۔ شعری کردار، اس کے مخاطب، لفظوں سے ابھرنے والے تلازمات، شعری کردار کی داخلی صورتحال، اس کا لہجہ وغیرہ مل کر شعر کے داخلی تجربے کی تجسیم کرتے ہیں۔

غالب، میر، اقبال اور فیض وغیرہ کے اشعار میں بھی یہی ڈرامائی صورتحال ابھرتی ہے جو اپنی ماہیت کے اعتبار سے فرضی ہوتی ہے، ان کے اشعار میں جو صورتحال ابھرتی ہے وہ اپنے جلو میں کئی سارے منظر نامے سمیٹتی ہے اس کے برعکس معنی کا سفر مستقیم ہوتا ہے ہم تجربے کو منحنی خطوط کا ایک جال بھی قرار دے سکتے ہیں جس میں صورتحال سے صورتحال ابھرتی ہے۔

س۔الف: آپ کا موقف یہ ہے کہ تجربہ معنی سے الگ ہے معنی کا سفر مستقیم ہوتا ہے جب کہ تجربہ جہت در جہت ہوتا ہے یہ منحنی خطوط کا جال ہوتا ہے، لیکن آپ نے اپنی کتاب ''اکتشافی تنقید کی شعریات'' کے صفحہ ۶۶ پر لکھا ہے کہ ''متن جو کائناتی فینامینا کی ہی ایک خود مرتکز تصغیری صورت ہے کی کوئی معینہ صورت نہیں ہوسکتی ہے یہ زماں و مکاں کی مانند توسیع اور تعلیق کے مسلسل اور پیچیدہ عمل سے گزرتا ہے اور ہر آن نو بہ نو جلوں کو خلق کرتا ہے۔'' اسی کتاب کے صفحہ ۷۵ پر آپ لکھتے ہیں کہ ''ہئیتی تنقید سے میرا طریق کار اس وقت قطعی مختلف ہوجاتا ہے جب میں ہئیتی تنقید جو Close Reading کے ذریعے متن سے کلی یا جزوی موضوع کی کشید کرتی ہے کے خلاف سے اس کے ماخذ، محرک یا منشا سے متعارض ہوئے بغیر عضوی یا کلی تخلیقی وجود کی دریافت پر زور دیتا ہوں۔'' اسی کتاب کے صفحہ ۷۹ پر آپ لکھتے ہیں کہ ''شعر کی تکمیل میں شاعر کے شعوری اور لاشعوری عوامل کی طرح منشائے مصنف کا بھی عمل دخل رہتا ہے، لیکن ان کی کوئی تشکیلی حیثیت نہیں ہوتی ہے یہ بشمولِ منشائے مصنف اپنی محرکانہ حیثیت ہی رکھتے ہیں اور تکمیل یافتہ تجربہ ان سب سے ماورا ہوتا ہے'' پہلے آپ صفحہ ۶۶ پر لکھتے کہ متن کی کوئی معینہ صورت نہیں ہوتی ہے۔ یہ مسلسل توسیع و تعلق کے عمل سے گزرتا ہے سوال یہ ہے کہ اگر متن مسلسل توسیع و تعلیق کے عمل سے گزرتا ہے تو تکمیل یافتہ تجربہ کس طرح متن میں بار پا سکتا ہے جب متن ہی Instable ہے تو تجربہ مکمل کیسے ہوسکتا ہے؟

ح۔ک: تجربہ شعر کی تخلیقیت کو قائم کرتا ہے تجربہ رنگا رنگ ہوتا اور کثیر الجہت بھی، شعر میں استعمال ہونے والے الفاظ بھی Multi Dimensional ہوتے ہیں۔ غالب کا شعر ہے:

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے میرے ارماں مگر پھر بھی کم نکلے

مروجہ تنقید اس کے سیدھے معنی یہ نکالتی ہے کہ شاعر خواہشوں کے تشنۂ تکمیل رہنے کی بات کرتا ہے اس طرح کا تشریحی رویہ شعر کی شعریت کو مجروح کرتا ہے۔ مذکورہ شعر میں متکلم خود کلامی کے لہجے میں کہتا ہے یا کسی دوسرے شعری کردار سے مخاطب ہوکر لفظ خواہش کے لباس میں اپنی داخلی صورتحال کو بیان کرتا ہے اور اپنی کسی مخصوص خواہش کا ذکر کیے بغیر ''ہزاروں خواہشیں'' کہہ کر اس کے تعین کو ملتوی کرتا ہے۔ متکلم کہتا ہے کہ میری ہر خواہش اتنی تیز، اتنی شدید اور اتنی عمیق ہے کہ اگر میں اس سوچنے بیٹھ جاؤں تو میرا دم نکل جائے گا۔ جوں ہی قرأت معنی کی سطحوں کو چیر کر گہرائی میں اترتی ہے تو تجربے کی رنگارنگی اپنا اکتشاف کرتی ہے۔

س۔الف: حامدی صاحب! آپ کی دلیلوں سے اتفاق کرتا ہوں تجربہ رنگارنگ ہوسکتا ہے کثیر الجہت ہوسکتا ہے، لیکن پوچھنے کا اصل مقصد یہ ہے کہ کیا تجربہ مکمل ہوسکتا ہے؟

ح۔ک: تجربہ اگرچہ کلی طور پر مکمل نہیں ہوتا ہے تاہم اپنی ماہیت کے اعتبار سے نامیاتی ہوتا ہے یہ متن کی کلاہم لسانی ساخت میں مستور ہوتا ہے متن سے جو کثیر پہلو صورتحال ابھرتی ہے وہ تجربے کی توسیع کا کام سرانجام دیتی ہے تجربہ مختلف رنگوں میں اپنا اکتشاف کرتا ہے۔

س۔الف: لیکن Post-Structuralist مکتبۂ تنقید سے تعلق رکھنے والے مفکرین کہتے ہیں متن خلقی اعتبار سے Instable ہوتا ہے اس کی ساخت کو نامیاتی کہنا محض ساختیاتی فکر کا مسلط کردہ مغالطہ ہے جب کہ انتشار اس کی سرشت میں رقم ہوتا ہے؟

ح۔ک: پس ساختیاتی مفکرین بھی کہتے ہیں کہ متن کا ہر لفظ کثیر الجہت صورتحال کو انگیز کرتا ہے۔

س۔الف: آپ کی تھیوری پر کئی سارے الزامات عائد کیے گئے۔ آپ کے معاصر نقادوں میں بیشتر کی رائے یہ ہے کہ حامدی کاشمیری نے اکتشافی تنقید کے نام سے ہئیتی تنقید کو Rechristen کیا، یہ بھی کہا گیا کہ آپ کی تھیوری کے بنیادی مفروضات ہئیتی تنقید سے مستعار ہیں آپ نے صرف نئی بوتل میں پرانی شراب بھیجی؟

ح۔ک: (قہقہہ) میرے خیال میں یہ تاثر بالکل غلط ہے۔ میں وہاں سے اپنا

سفر شروع کرتا ہوں جہاں ہیئتی تنقید ختم ہوجاتی ہے۔ ہیئتی تنقید معنی و مفہوم کے پیچھے پڑ جاتی ہے اس لیے وہ زیادہ دیر تک نہیں پائی اور سین سے ہٹ گئی۔ آپ ایلیٹ کو دیکھیں، غالب کو دیکھیں یا دنیا کے کسی بھی بڑے قلم کار کا جائزہ لیں، ان میں سے ہر ایک تجربے کی تلاش میں رہتا ہے اور تجربہ ہی ہر بڑے تخلیق کار کی شناخت قائم کرتا ہے:

گھرا ہوں کالی دیواروں میں کب سے
نکل جانا کوئی آساں نہیں ہے

ہیئتی تنقید کی رو سے اس شعر کے معنی بالکل واضح ہیں پھر سے مذکورہ شعر میں مستور تجربے کی وضاحت کر کے میں خود کو دوہراؤں گا نہیں تاہم اتنا ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ میری تھیوری ہیئتی تنقید کی بنیادوں پر چوٹ کرتی ہے۔

س۔الف: الزام یہ بھی عائد کیا جاتا ہے کہ حامدی کاشمیری کہتے ہیں تجربہ متن کی لسانی اکائیوں اور تدابیر سے مشروط ہوتا ہے ان تدابیر میں وہ استعارہ، علامت اور پیکر کو کلیدی رول کی حامل قرار دیتے ہیں، لیکن ان سے پہلے ہی ہیئتی تنقید سے وابستہ نقادوں نے متن سے ابھرنے والے Aesthetic Experience کو اس کی لسانی تدابیر سے مشروط قرار دیا تھا۔ الزام عائد کرنے والوں کے مطابق آپ جس طرح تجربے کو شعر میں دریافت کرتے ہیں وہ اس کی تلخیص محض ہو کے رہ جاتی ہے؟

ح۔ک: الزام لگانے والوں کا اپروچ غلط ہے یا پھر انھوں نے میری تھیوری کو غور سے پڑھا ہی نہیں ہے اور اس سوال کا جواب میں پہلے ہی دے چکا ہوں۔

س۔الف: رسالہ ''استعارہ'' میں گوپی چند نارنگ نے آپ کی تھیوری پر ایک مضمون لکھا ہے۔ اس میں وہ آپ کے تصورِ تجربہ سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ حامدی کاشمیری کا تصورِ تجربہ بھی اپنی تفہیم کے لیے معنی کا محتاج نظر آتا ہے۔ وہ کہتے ہیں آپ تجربے کی بات کرتے کرتے پھر معنی کی جانب لوٹ جاتے ہیں؟

ح۔ک: دیکھیے نارنگ صاحب کیا کہتے ہیں کیا نہیں کہتے ہیں اس سے مجھے کوئی غرض نہیں ہے میرا موقف یہ ہے کہ معنی الگ چیز ہے اور تجربہ الگ چیز ہے۔ نارنگ صاحب کا مضمون میں نے بھی دیکھا ہے، لیکن اس مضمون میں انھوں نے معنی کی ماہیت پر بات نہیں کی ہے پھر سے مثال دیتا ہوں:

کوئی حسرت کوئی ارماں نہیں ہے
تیرے آنے کا اب امکاں نہیں ہے

مذکورہ شعر کے پہلے مصرعے میں جو فرضی کردار ابھر کر سامنے آتا، وہ یا تو خود کلامی کے لہجے میں کہتا ہے یا کسی دوسرے فرضی کردار سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔ مجھے تیرے آنے کی بہت زیادہ توقع تھی، لیکن بہت عرصہ گزرا، لیکن تو نہیں آیا، نتیجتاً جو ارمان اور حسرتیں میں نے تیری ذات سے وابستہ کر رکھی تھیں وہ اپنی شدت اور حرارت کھو چکی ہیں۔ دوسرے مصرعے میں متکلم اپنے مخاطب (جو حاضر بھی ہوسکتا ہے اور غائب بھی) کے حوالے سے کہتا ہے کہ تیرے آنے کے سارے امکانات ختم ہو چکے ہیں، لیکن کیوں ختم ہو چکے ہیں اس کا وہ جواب نہیں دیتا ہے اور یہی خاموشیاں پھر متنوع تلازمات کو ابھارتی ہیں۔ اصل میں یہ شعر کا داخلی تجربہ ہے جو نو بہ نو جلوں کو خلق کرتا ہے اور معنی سے ماورا ہو کر اپنے آزادانہ وجود کا اثبات کرتا ہے اس لیے نارنگ صاحب کا خیال میرے تصورِ تجربہ سے متعلق قطعی طور پر غلط ہے۔

س۔الف: آپ نے اپنی کتاب ''اکتشافی تنقید کی شعریات'' کے صفحہ ۸۱ پر لکھا ہے کہ ''شاعری کو اس کے وسیع تر کائناتی تناظر میں دیکھنے سے اس کی آفاقیت کے تصور کو پرکھنے کا تصور لاحق ہوجاتا ہے ظاہر ہے شاعری میں ان اصولوں کی نشاندہی کرنا لازمی ہوجاتا ہے جو عالمگیریت رکھتے ہیں۔'' آپ کا مفروضہ یہ ہے کہ شاعری میں پیش کیا جانے والا تجربہ Universal ہوتا ہے، لیکن مابعد جدید مکتبہ ہائے فکر سے تعلق رکھنے والے دانشور تجربے/آئیڈیالوجی کی عالمگیر معنویت کے منکر ہیں۔ ان کے مطابق ہر تجربہ مقامی ہوتا ہے اور ایک مخصوص ثقافتی ولسانی مزاج کا حامل ہوتا ہے۔ مشل فوکو کہتا ہے کہ ہر ثقافت انسانی وجود Human Existence اور کائناتی مظاہر کی تفہیم کے تعلق سے جن تدابیر کو بروئے کار لاتی ہے وہ طاقت کی زائیدہ ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے دائرۂ کار میں محدود ہوتی ہیں۔ علمیہ Episteme ہمیشہ مقامی ہوتا ہے اور کسی عالمگیر انسانی صورتحال کو نہیں درشاتا ہے۔ اس کا اطلاق اگر شعر وادب پر کیا جائے تو اس میں بھی فوکوی توضیحات کی رو سے علمیہ/آئیڈیالوجی اپنا اثبات کرتی ہے، لیکن آپ کا موقف یہ ہے کہ شعر سے ابھرنے والا تجربہ عالمگیر ہوتا ہے آپ کے پاس کیا دلیل ہے کہ تجربہ عالمگیر معنویت کا حامل ہوتا ہے؟

ح۔ک: میری دلیل خود شعری متن ہے۔ دوسری بات یہ کہ میں اس کو مشل فوکو یا کسی دوسرے صاحب کی لاعلمی سے تعبیر کرتا ہوں جو یہ کہتے ہیں کہ شعر میں پیش کیا جانے والا تجربہ Universal معنویت سے محروم ہوتا ہے تخلیقی تجربہ آئیڈیالوجی یا کسی Episteme وغیرہ سے ماورا ہوتا ہے تجربہ کے اکتشاب کی ہیئتی اور لہجے مختلف ہوسکتے ہیں، لیکن گہری سطح پر تجربہ کلہم انسانی برادری کی داخلی واردات کو سمیٹتا ہے۔ تجربہ ماورائے سیاست اور ماورائے آئیڈیالوجی ہوتا ہے، میرا ایک شعر ہے:

جاگ کر بھی خواب کا عالم رہا
وادیٔ خوں ناب کا عالم رہا

مذکورہ شعر کو اگر ایک عام قاری پڑھے گا تو وہ بادی النظر میں یہ ہی کہے گا کہ شاعر کشمیر کی معاصر صورتحال کو بیان کر رہا ہے، لیکن گہری سطح پر یہ شعر جس تجربے کا اکتشاف کرتا ہے وہ اپنی ماہیت کے اعتبار سے عالمگیر ہے اگر ہم اس سے ابھرنے والے تجربے کو Episteme یا آئیڈیالوجی کا ماحصل قرار دیں تو اس کا تخلیقی وجود محدود ہو کے رہ جائے گا تجربہ ہمیشہ عالمگیر معنویت کا حامل ہوتا ہے، لیکن شرط ہے کہ شعر تخلیقی تقاضوں کو پورا کرتا ہو۔

س۔الف: قمر رئیس نے آپ کی کتاب ''معاصر اردو تنقید'' کے بارے میں لکھا ہے کہ ''یہ بیسویں صدی کی گمراہ کن کتاب ہے''؟

ح۔ک: (مسکراتے ہوئے) قمر رئیس اور دوسرے ترقی پسند نقاد کہتے ہیں کہ میری تھیوری سماج اور تہذیبی عوامل کو نظر انداز کرتی ہے یہ من مانی باتوں پر مبنی ہے، لیکن اس کے برعکس میرا موقف یہ ہے کہ شاعری اگر برہنہ ہو تو وہ تخلیق کے معیار سے گر جاتی ہے ترقی پسند دور میں لکھا گیا ادب بہت کم تخلیقی تقاضوں کو پورا کرتا ہے میرا یہ ابتدا سے ہی موقف رہا ہے کہ شاعری میں پیش کیا جانے والا تجربہ ماورائے سیاست ہوتا ہے باقی قمر رئیس صاحب اللہ مغفرت کرے، کی ساری تنقید اشتراکی منشور کا حاشیہ دکھائی دیتی ہے۔

س۔الف: آپ کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ترقی پسند ادب اس لیے تخلیقی تقاضوں کو پورا نہیں کرتا ہے کہ اس میں نری حقیقت نگاری ہے اور ترقی پسند تنقید محض اشتراکی منشور کا حاشیہ ہے، لیکن پچھلی کئی دہائیوں سے مارکسی فکر کئی ساری تبدیلیوں سے گزری۔ اب نو مارکسیت یا Revisionist Marxism کے نام سے ایک نیا ڈسکورس سامنے آیا ہے جس کو Frankfurt School of Theory کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔ نو مارکسی مکتبۂ تنقید سے تعلق رکھنے والے مفکرین کا کہنا ہے کہ جہاں متن کی تشکیل میں زبان کا رول کلیدی ہوتا ہے وہیں آئیڈیالوجی زبان کے جینیاتی نظام میں ایک جامع رمز Code کے بطور رقم ہوتی ہے۔ آئیڈیالوجی کبھی بھی معصوم اور غیر جانبدارانہ نہیں ہوتی ہے بلکہ طاقت اور ادارہ جاتی نظام کی پروردہ ہوتی ہے اور یہی آئیڈیالوجی تخلیقی اور غیر تخلیقی متون میں اپنا اثبات کرتی ہے اس لیے متن کبھی بھی غیر سیاسی اور الہامی نہیں ہوتا ہے آپ کی کیا رائے ہے؟

ح۔ک: روایتی مارکسیت اور نو مارکسی مکتبۂ تنقید سے تعلق رکھنے والے نقاد متن کو ایک مخصوص نظریاتی عینک سے دیکھنے کے عادی ہیں وہ متن کی ساخت میں پنپنے والے تخلیقی تجربے کو سیاست کی بھینٹ چڑھاتے ہیں اور اس کی جگہ آئیڈیالوجی وغیرہ کا راگ الاپتے ہیں میں نے آپ سے پہلے بھی کہا کہ تجربہ وہبی ہوتا ہے اور آئیڈیالوجی/ سیاست وغیرہ سے ماورا ہوتا ہے۔ شاعری چیزے دگر است، اس کو کسی سیاسی پیمانے سے ناپنے کو میں اس کی روح کو پامال کرنے کے مترادف قرار دیتا ہوں۔

س۔الف: شمس الرحمان فاروقی نے آپ کی تھیوری کے بارے میں لکھا ہے کہ ''حامدی کاشمیری اکتشافی تنقید کا خون لگا کر تھیوری کے شہیدوں میں شامل ہونا چاہتے ہیں''؟

ح۔ک: (قہقہہ) شمس الرحمان فاروقی جیسے پڑھے لکھے نقاد کے قلم سے جب اس طرح کے غیر ذمہ دارانہ الفاظ نکلے تو صرف افسوس کیا جا سکتا ہے یہ ان کی ذاتی رائے ہے جس کا میری تھیوری کے بنیادی مقدمات سے کوئی تعلق نہیں، میری تھیوری پر کوئی بامعنی بحث قائم کرنے کے بجائے انھوں نے فتویٰ دے دیا۔

فاروقی صاحب کی ہر تنقیدی کتاب کا میں نے بغور جائزہ لیا ہے۔ ان کی تحریروں کو پڑھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ مضمون لکھتے وقت بہت زیادہ عجلت سے کام لیتے ہیں وہ کہتے تو بہت کچھ ہیں، لیکن ثابت شاید کچھ بھی نہیں کر پاتے۔ مضمون کے پہلے ہی جملے سے بحث چھیڑتے ہیں جو بالآخر تشنۂ تکمیل ہی رہتی ہے۔

ان کی کتاب ''شعر شور انگیز'' کی بات کی جائے تو اس میں انھوں نے فقط میر کے شعروں کے دو دو چار چار معنی بیان کیے ہیں اس طرح کا تشریحی اپروچ اختیار کر کے فاروقی صاحب میر کے شعروں سے ابھرنے والے جہت در جہت تجربے کو معنی کی صلیب پر لٹکاتے ہیں۔ میں یہ کہنے کی آزادی لوں گا کہ فاروقی صاحب میر کے شعروں کے تجربے تک رسائی حاصل کرنے میں بری طرح ناکام ہوئے ہیں۔

س۔الف: تھیوری کی جامع اصطلاح کے تحت کئی سارے مباحث سامنے آئے جیسے ساختیات، پسِ ساختیات اور اس قبیل کے دوسرے کلامیے، آپ ان سے کس حد تک متاثر ہوئے؟

حامدی کاشمیری: میں نے ان نظریات کو پڑھا ضرور ہے، لیکن میری تھیوری کے حوالے سے ان مباحث کی تشکیلی حیثیت صفر کے برابر ہے۔

س۔الف: آپ کی تھیوری کے حوالے سے آخری سوال، کیا آپ کے مکتبۂ تنقید کو آگے بڑھانے والا خود بھی تخلیق کار ہو کیونکہ آپ کے مطابق تخلیق پر اسرار ہوتی ہے؟

ح۔ک: ضروری نہیں ہے، لیکن نقاد کا باشعور ہونا لازمی ہے تاکہ تجربہ اس پر اپنا اکتشاف کر سکے۔

س۔الف: حامدی صاحب! میرے خیال میں بنیادی موضوع کے حوالے سے مجھے جو پوچھنا تھا وہ میں پوچھ چکا ہوں اب میں موضوع سے ہٹ کے آپ سے چند سوالات کرنے کی اجازت چاہوں گا:؟

ح۔ک: (مسکراتے ہوئے) شوق سے۔

س۔الف: جس وقت آپ شعر لکھتے ہیں تو اس وقت آپ کا تنقیدی شعور آپ کی رہنمائی کرتا ہے؟

ح۔ک: جی بالکل، وہ تخلیق کے Process کے دوران میرا ساتھ ہی رہتا ہے۔

س۔الف: اردو تنقید کی موجودہ صورتحال کے بارے میں آپ کیا کہنا چاہیں گے؟

ح۔ک: جس زمانے میں، میں تنقید لکھتا تھا (اب تو صرف شعر لکھتا ہوں) اس وقت اردو کے تنقیدی افق پر تین نام چھائے ہوئے تھے۔ پاکستان کے وزیر آغا، دلی کے گوپی چند نارنگ اور الٰہ آباد کے شمس الرحمان فاروقی ان کے علاوہ جتنے بھی لوگ تنقید لکھتے تھے ان کی حیثیت حاشیائی تھی، لیکن ان تین نقادوں کے سمیت کوئی بھی شعر سے ابھرنے والے تجربے کی بات نہیں کرتا تھا اور نہ ہی کسی نے کی ہے ساری تنقید مکتبی مزاج کی حامل تھی اور نقاد تشریحی رویوں سے کام لے رہے تھے۔ موجودہ تنقید بھی شعر کے باطنی تجربے کو ٹٹولنے کے حوالے سے بری طرح ناکام نظر آتی ہے۔

س۔الف: جموں وکشمیر میں لکھنے جانے والے ادب (چاہے وہ شاعری ہو یا پھر افسانہ) سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟

ح۔ک: جموں وکشمیر میں لکھا جانے والا بیشتر ادب ٹھوس تخلیقی قوتوں سے محروم نظر آتا ہے۔ شاعری کے حوالے سے تو صورتحال اتنی مایوس کن نہیں ہے تاہم فکشن کے حوالے سے ابھی تک ایک بھی Genuine قلم کار سامنے نہیں آیا ہے اور شاعری بھی تناسب کے لحاظ سے پانچ دس فی صد ہی معیاری ہے ادب خواہ وہ شاعری ہو یا پھر افسانہ جب تک تخلیقی تقاضوں کو پورا نہیں کرتا ہے اسے Genuine قرار نہیں دیا جاسکتا ہے۔

س۔الف: آپ کا مضمون بہت پہلے رسالہ بازیافت میں شائع ہوا ہے اس میں آپ نے اس وقت کے نوجوان شعرا میں سے شفق سوپوری اور اقبال فہیم کو معیاری شاعر قرار دیا ہے کیا آپ آج بھی اپنی رائے پر قائم ہیں؟

ح۔ک: اُس وقت تو اچھا لکھتے تھے اِس وقت کا مجھے پتہ نہیں ہے لیکن اس وقت رفیق راز قدرے بہتر لکھتے ہیں؟

س۔الف: حامدی صاحب! آپ کی شخصیت کثیر الجہت ہے۔ آپ نے تنقید لکھی، شاعری کی اور فکشن بھی لکھا، ذاتی طور پر آپ خود کو کہاں مطمئن پاتے ہیں؟

ح۔ک: شاعری میں، اس لیے عمر کے اس مقام پر پہنچ کر بھی مجھ سے شوقِ سخن نہیں چھوٹا۔

س۔الف: ملکی اور ریاستی سطح پر آپ کے خیال میں اردو کا مستقبل کیا ہے؟

ح۔ک: کوئی بھی زبان تب تک فروغ نہیں پاتی ہے جب تک کہ اس کو سرکاری پشت پناہی حاصل نہ ہو۔ اردو کا دائرۂ کار ایک بولی کی صورت میں وسعت پا رہا ہے اور بحیثیت زبان یہ شدید قسم کے خطرات سے دوچار ہے۔ سرکار اگر ٹھوس اقدام اٹھاتی ہے تو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے ورنہ زیادہ دیر تک خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہا جاسکتا ہے۔

س۔الف: آجکل ریاست کے اردو حلقوں میں ایک تاثر بہت عام ہو چکا ہے اور وہ یہ کہ ''کشمیر اردو کی آخری پناہ گاہ ہے''۔ کیا اتفاق کرتے ہیں؟

ح۔ک: کسی حد تک کیونکہ باقی ریاستوں میں اردو کی صورتحال ناگفتہ بہ ہے۔ سچ پوچھیے تو اردو کو مذہب کے ساتھ جوڑ کر اسے پیچھے کی اور دھکیلا جارہا ہے۔ بہار اور اتر پردیش کی سرکاروں نے اردو کی ترویج کے حوالے سے کچھ منصوبہ جات تشکیل دیے تھے تاہم ان کی زمینی ترمیم کے حوالے سے کوئی ٹھوس قدم نہیں اٹھایا گیا۔ کشمیر میں اردو کالج اور ہائر سکینڈری سطح پر ایک اختیاری مضمون کے طور پڑھائی جارہی ہے، لیکن سرکاری زبان ہونے کی حیثیت سے اسے ایک لازمی مضمون کے بطور پڑھایا جانا چاہیے تب ہی ہمارا یہ دعویٰ صحیح ثابت ہوسکتا ہے کہ کشمیر اردو کی آخری پناہ گاہ ہے۔

س۔الف: حامدی صاحب! ایک آپ لمبے عرصے تک کالج اور یونیورسٹی سطح پر درس وتدریس کے پیشے سے وابستہ رہے ہیں آپ کے مطابق اردو کی تدریس سے وابستہ اساتذہ اپنی صلاحیتوں میں کیسے نکھار لا سکتے ہیں یا وہ کس طرح اپنی منصبی ذمہ داریوں کو بہتر طور پر سرانجام دے سکتے ہیں؟

ح۔ک: مطالعے میں زیادہ سے زیادہ وقت صرف کریں، تنقید اور تحقیق کی سطح پر جو نئی چیزیں سامنے آرہی ہیں ان کو سمجھنے کی کوشش کریں اور معاصر تنقیدی تناظرات کی رو سے بچوں کو ادب پڑھائیں۔ اساتذہ کو یہ بات ذہن میں رکھنی ہوگی کہ انھیں شاعری/افسانہ کی صورت میں جس چیز کا سامنا ہے وہ تہ در تہ ہے اس کی تفہیم اور تدریس کا کام وہ تب تک سرانجام نہیں دے سکتے ہیں جب تک کہ ان کے علم کا افق وسیع تر اور مشاہدہ ٹھوس نہ ہو۔ جس کا حصول مطالعے کے بغیر ناممکن ہے۔

س۔الف: حامدی صاحب! اپنا قیمتی وقت دینے کے لیے آپ کا بہت بہت شکریہ

ح۔ک: آپ کا بھی شکریہ

◆◆◆